فقہی اجتہاد اور نصوص و مصالح

مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں "دربارِ عالمگیری" کے عنوان سے قسط وار مضامین شائع ہو رہے ہیں، یہ پندرھویں قسط کا مضمون ہے جو الفرقان سے شکریے کے ساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مدیر

صحابہ کا اسی پر عمل درآمد رہا کہ علماء صحابہ ایسے موقع پر جمع کر لئے جاتے اور ان سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا جاتا۔ اس طرح گویا "اجماع" بھی اُصولِ شریعت میں سے ایک اصل سمجھی جانے لگی۔ اسی کے لگ بھگ تشریع (قانون سازی) کے سلسلے میں "تعامل اہل مدینہ" کو بھی حجت بننے میں دخل رہا، اور مسائل کو حل کرنے میں اس سے بھی استدلال کیا گیا۔ اس لئے کہ صحابہ (اہلِ مدینہ) مقتضیات احوال، ناسخ و منسوخ اور شئونِ حالیہ سے زیادہ واقف تھے۔

اس امر کا اظہار اس محل پر بے موقع نہیں کہ نصوصِ قرانیہ اور حدیثیہ کے برقرار رہتے ہوئے بعض ان احکام میں جو ان نصوص سے استخراج کئے گئے ہوں، مجتہدین اُمت کے لئے یہ گنجائش تسلیم کی گئی ہے کہ وہ زمانہ کے اقتضاء کے مطابق ان میں تغیر کر دیں، اور تغیر احوال کے مطابق فتویٰ بدل دیں۔ چنانچہ حافظ ابن قیم نے اپنی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" میں:۔

فصل فی تغیر الفتویٰ واختلافہا بحسب تغیر الازمنۃ والامکنۃ [1]	تغیر زمانہ اور اختلاف مکانی کے مطابق فتوے کے بدل جانے اور مختلف ہونے کا باب (CHAPTER)

کے تحت اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ باغ کے درختوں میں ابھی پھل نمودار نہیں ہوئے ان کی بیع نصاً جائز نہیں کیوں کہ یہ ایک نامعلوم اور مجہول چیز کی بیع ہے، لیکن بعض بلاد و امصار کے علماء اور اہلِ فتویٰ نے اگر کچھ پھل نکلے

[1] اعلام الموقعین، جز ثالث صفحہ ا و مابعد۔

ہوں اور کچھ نہ نکلے ہوں اس قسم کی بیع کو جائز رکھا ہے اور شمس الائمۃ حلوانی نے اس قسم کی معاملت کو ناجائز نہیں قرار دیا۔ چناں چہ ڈاکٹر احمد امین نے اپنی کتاب ضحی الاسلام میں لکھا ہے[۲]:۔

ومن امثلة ذلك ايضاً اجازة بعضهم بيع ثمار البستان اذا كان بعضها قد خرج وبعضها لم يخرج لان العرف جرى بذالك۔	اس کی مثالوں میں سے ایک مثال بعض علماء کا باغوں کے پھلوں کی بیع جائز رکھنا ہے جب کہ کچھ نکلے ہوں اور کچھ نہ نکلے ہوں اس لئے کہ مقامی عرف یہی تھا۔

پھر لکھتے ہیں:۔

وقال شمس الائمة استحسن ذلك لتعامل الناس فانهم تعاملوا بيع ثمار الكرم بهذه الصفة ولهم فى ذلك عادة ظاهرة وفى نزع الناس من عاداتهم حرج[۳]	شمس الائمہ نے فرمایا میں اس کو بُرا نہیں سمجھتا اس لئے کہ وہاں کے لوگوں کا اس پر عمل درآمد تھا اس لئے وہ لوگ انگور کی بیع اس شکل میں کرتے چلے آئے تھے اور لوگوں کو ان کی روش سے ہٹانے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اس مسئلہ میں کہ کسی چیز کے بیع کرنے میں کون کون اور دوسری چیزیں خصوصاً بیع مکان کے معاملہ میں داخل ہوتی ہیں اور کون کون چیزیں داخل نہیں ہوتیں۔ مصر کے علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ اگر کوئی اپنا گھر کسی کے ہاتھ فروخت کرے تو چونکہ قاہرہ میں مکانات علی العموم کئی طبقات کے ہوتے ہیں۔ اس لئے چڑھنے اُترنے کے لئے اگر وہاں کوئی علیحدہ سے سیڑھی موجود ہے تو بیع مکان میں اس کو بھی شامل سمجھا جائے گا خواہ بیع کرتے وقت اس کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ لیکن جہاں مکانات میں بالاخانے وغیرہ نہیں ہوتے وہاں اگر گھر میں بانس، لکڑی یا لوہے کی سیڑھی ہے تو وہ گھر کی بیع میں شامل نہ ہوگی اور مشتری بلا ذکر اور شرط اس کا حق دار نہ ہوگا[۴]۔

یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ علماء اور مفتیوں کے اس طرح کے فتوے دینے میں نص قرآن اور نص حدیث دونوں کا نسخ مجتہدین کی رائے سے لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہدین نے نصوص کو اپنی جگہ برقرار رکھا ہے اس لئے کہ ان کا نسخ ان کے دائرہ اختیار سے خارج تھا، لیکن اس نص سے جو حکم منتزع ہوتا تھا

---

[۲] ضحی الاسلام جزء ثالث ص۲۲۹ [۳] رسائل شمس الائمہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۱ [۴] ضحی الاسلام جزء ثالث ص۲۲۹۔

اس کو مصالح پر نظر کر کے بدل دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصارفِ صدقات سے مؤلفۃ القلوب کے مصرف کو اپنے دورِ خلافت میں موقوف کر دیا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اس مصرف کا نفاذ اس وقت کے مناسب تھا جب اسلام ابتدائی مرحلہ میں اضمحلال اور ضعف کے ساتھ ترقی پذیر تھا اور اس وقت کا اقتضا تھا کہ مظنون شر و فتنہ سے بچے رہنے کی تدابیر کی جائیں اور جب اسلام کو شوکت اور دبدبہ حاصل ہوگیا اس وقت اس کی احتیاج نہ رہی۔ ظاہر ہے کہ اس شکل میں نص قرآنی کی منسوخیت اختیار سے باہر تھی۔ لیکن زمانہ کے بدلنے کے ساتھ حکم میں تبدیلی کر دی گئی، اس کو نص کا نسخ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ خاص حالات میں نص کے نفاذ اور عدم نفاذ کے بارہ میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ ایک فیصلہ تھا۔

اسی طرح سارق کی سزا قطع ید ایک نص قرآنی ہے لیکن اگر دورہ آجائے کہ لوگ قحط اور غلہ کی نایابی کی وجہ سے بھوکے مرنے لگیں تو سرقہ کے ارتکاب کی صورت میں بجائے ہاتھ کاٹ ڈالنے کے تعزیراً اس کو دوسری سزاؤں کے دینے پر اکتفا کیا:-

معتبرا ان السرقۃ ربما کان یندفع الیھا السارقون حینئذ بدافع الضرورۃ لا بدافع الاجرام وفی ذلک شبھتہ فی الجرم علی الاقل والحدود تندرئ بالشبہات ۵

ان کے پیشِ نظر یہ بات رہی کہ ایسے حالات میں بسا اوقات چرانے والے بھوک کی مجبوری سے اور مضطر ہو کر چراتے ہیں، ان میں ارتکاب جرم کا داعیہ نہیں ہوتا، کم از کم ان کا جرم کی نیت سے کرنا مشتبہ تو ہو ہی جاتا ہے، اور قاعدہ ہے کہ حدود میں مجرم کو شبہ کا فائدہ دے کر حدود ساقط کر دی جاتی ہیں۔

اسی طرح حالات زمانہ کے بدلنے سے احکام کے بدل جانے کی ایک اور واضح مثال اور نظیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عراق، مصر اور شام کی زمینوں کا مجاہدین پر تقسیم نہ کرنے کا فیصلہ ہے، جب کہ نص قرآنی اور حدیث سے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل بظاہر اس کے خلاف تھا۔ نص قرآنی کا مفاد یہ ہے کہ ملک فتح کرنے کے بعد مالِ غنیمت اور زمین کا ۱/۵ حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے اور بقیہ کو فاتحین پر تقسیم کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی رہا۔ جب خیبر کی سرزمین فتح ہوئی تو ۱/۲ حصہ

---

۵ الحقوق المدنیۃ استاذ زرقا جزو اوّل ص ۷۲ بحوالہ المدخل۔

بیت المال کے لئے نکالنے کے بعد آپ نے بقیہ کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا اور یہ ارشاد خداوندی :-

واعلموا انما غنمتم من شیئٍ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامٰی والمساکین وابن السبیل -

کے عین مطابق تھا - چناں چہ مجاھدین ان ممالک کے فتح ہونے پر اسی توقع کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور انھوں نے اپنی عرضداشت پیش کی - حضرت عمرؓ نے جو جواب دیا، وہ یہ ہے :-

" دیکھو جب بعد کو مسلمان اس سرزمین پر قدم رکھیں گے تو انہیں یہ منظر نظر آئے گا کہ وہاں کی کل زمین کے حصے بخرے کئے جا چکے اور لوگ وراثتاً اس کے مالک بنے بیٹھے ہیں، اور آرام کر رہے ہیں - میں اس کو روا نہیں رکھ سکتا، اس پر عبد الرحمان بن عوف نے بڑھ کر پوچھا کہ پھر آپ کی رائے کیا ہے ؟ کیا یہ زمین وغیرہ مجاہدین کے لئے عطاء خداوندی نہیں ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بات وہی ہے جو تم کہتے ہو لیکن اس معاملے میں میری رائے یہ نہیں ہوئی اس لئے کہ آئندہ فتوحات ملکی میں مسلمانوں کو کوئی بڑا مادی نفع نہیں ہوگا بلکہ کسی سرزمین کا رکھ رکھاؤ ہی ان کے لئے ایک وبال جان بن جائے گا - جب زمین اور کاشت کاروں کی یوں تقسیم کر دی گئی تو حکومتِ اسلامیہ کے لئے ذریعہ آمدنی کیا ہوگا جس سے آئندہ سرحدوں کی حفاظت، دشمنوں کی مدافعت، بیواؤں اور یتیموں کی دیکھ بھال ہو سکے "

بہر کیف حضرت عمرؓ سے بہت کچھ لوگوں نے اصرار کیا اور یہ کہنے لگے کہ ہماری تلواروں کی بدولت ہمیں جو کچھ مل رہا ہے اُس سے آپ ہمیں محروم کر دینا چاہتے ہیں اور ہم کو چھوڑ کے آپ کے ملحوظِ خاطر وہ لوگ ہیں، جنھوں نے نبرد آزمائی کے موقع پر نہ تلوار ہاتھ میں لی اور نہ میدانِ جنگ میں حاضر ہوئے - آپ کے پیشِ نظر آئندہ آنے والی نسلیں ہیں، ہمارا حق آپ نے پسِ پشت ڈال دیا - اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: بہر حال یہ میری رائے ہے - لوگوں نے کہا یہ آپ کی رائے ہے تو آپ اس معاملہ میں اور بزرگوں اور لوگوں سے بھی مشورہ کر لیں - چناں چہ آپ نے مہاجرین اوّلین کو بلایا اور اُن سے مشورہ کیا - اس میں بھی اختلافِ آرام ہوا - عبد الرحمٰن بن عوف کی وہی سابق رائے تھی لیکن حضرت عثمان، طلحہ اور ابن عمرؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی - پھر آپ نے دس سربرآوردہ انصار کو بلا کے ایک میٹنگ کی جس میں آپ نے سب سے پہلے یوں تخاطب کیا :-

" میں نے جو آپ کو زحمت دی اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ لوگ بار امانت میں اور ان معاملات

میں جو آپ نے مجھے تفویض کر دیئے ہیں میرے شریک ہوں، میں بھی آپ کا ہی ایک فرد ہوں۔ مخالفتیں اور موافقتیں ہو چکیں۔ اب آپ حق شناسی سے کام لیں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ میرا ساتھ ہی دیں۔ کتاب اللہ آپ کے پاس ہے وہ خود حق کا اظہار کر دے گی۔ بخدا میں نے اگر اپنا مطمح نظر ظاہر کیا تو وہ بھی اسی سے اخذ کر کے "

اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا آپ کچھ فرماتے کہ ہم بھی سن لیتے، چناں چہ آپ نے فرمایا کہ :۔

" تم نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس معاملے میں میں ان پر ظلم کر رہا ہوں اور ان کی حق تلفی کے درپے ہوں۔ العیاذ باللہ میں اور ظلم ؟ میری بدبختی ہوگی اگر میں ان کا حق مار کے دوسروں کو دے دوں، میرے ذہن میں تو یہ بات آئی کہ ملک فارس (کسریٰ) کے فتح کے بعد اتنی بڑی سرزمین اور کون فتح کرنے کو باقی ہے، اللہ تعالیٰ نے بطور غنیمت ان کے اموال اور زمینوں وغیرہ پر ہم کو تسلط دیا تو اموالِ منقولہ تو میں نے ان پر ہی تقسیم کر دیئے، خمس کو خمس کے مقصد و مصرف میں لے لیا، اب رہ گئی یہاں کی زمین اور کاشت کار، اُس کو اپنے قبضہ میں رکھ کے میں نے یہ ترکیب کی کہ یہ انہیں کے سپرد کر دی جائے اور اس کے بدلہ میں ان سے خراج اور جزیہ لیا جایا کرے جو مجاہدین اور ان کی اولاد در اولاد کے کام آتی رہے۔ بہر حال ان محاذوں کا مستقل فوجوں کے قیام کے ذریعہ تحفظ بھی ضروری ہے، آخر یہ بڑے بڑے شام، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے شہروں میں فوجیں رکھنا اور ان کے رکھ رکھاؤ کے اخراجات ناگزیر ہی ہیں۔ اگر یہ زمینیں میں فاتحین اور مجاہدین کو بانٹ دوں تو ان کو آزوقہ دینے اور ان کے رکھ رکھاؤ کے لئے آمدنی کہاں سے آئے گی "

حضرت عمرؓ کی یہ تقریر سن کر سب نے آپ کی رائے کی تائید کی اور کہا کہ واقعی اگر یہاں فوجیں نہ رہیں اور ان کے رکھ رکھاؤ کے لوازمات پورے نہ ہو سکے تو دشمنانِ اسلام ان شہروں پر پھر قابض ہو جائیں گے چنانچہ زمین کی مساحت (پیمائش) کر کے اس کا انتظام کیا گیا۔ اور بات ختم ہوئی۔

بہر کیف اس واقعہ کو اس تفصیل سے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہاں کی زمینیں حضرت عمرؓ نے وہاں کے باشندوں ہی کی سپردگی میں دے کے ان سے خراج وصول کرنے کا انتظام کیا اور مجاہدین فاتحین پر تقسیم نہ کیں اور حضرت عمرؓ نے اپنی خدا داد قوتِ اجتہاد سے نقل قرآنی اور حدیث نبوی کا محل اور منشاء

ظاہر کر دیا اور یہ سبق بھی دے دیا کہ نصوص کو ہمیشہ مقاصد شریعت اور عامۃ الناس کی فلاح اور بہبود کی روشنی میں دیکھ کے اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

یہ بات واضح رہے کہ حضرت عمرؓ کے اس فعل میں حاشا ثم حاشا سنتِ نبوی کی مخالفت پنہاں نہ تھی۔ بلکہ دوسری آیاتِ قرآنیہ کو سامنے رکھ کے مصالحِ عامہ کی روشنی میں ایک قسم کا عمل در آمد تھا۔ یہ صحیح ہے کہ خیبر کی آراضی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین پر تقسیم کر دی تھی، اس وقت مصالح وقتی کا تقاضا یہی تھا کہ یہ مجاہدین اپنا گھر بار، مال و متاع چھوڑ کے مکہ سے آئے تھے اور اب حضرت عمرؓ نے اس طرح تقسیم نہیں کی، اب مصلحتِ وقتی اسی کی مقتضی تھی۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں:۔

والذی رأی عمر رضی اللہ عنہ من الامتناع من قسمۃ الارضین بین من افتتحھا عند ما عرفہ اللہ ما کان فی کتابہ من بیان ذلک توفیقا من اللہ کان لہ فیما صنع وفیہ کانت الخیرۃ لجمیع المسلمین وفیما رآہ من جمع خراج ذلک وقسمتہ بین المسلمین عموم النفع لجماعتھم لان ھذا لو لم یکن موقوفا علی الناس فی الاعطیات والارزاق لم تشحن الثغور ولم تقو الجیوش علی السیر فی الجھاد ۶	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ جو رائے ہوئی کہ زمینوں کو فاتحین پر تقسیم نہ کیا جائے یہ اس وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مسئلہ کی اپنی کتاب سے سمجھنے کی توفیق عطا فرما دی، اس میں آپ کے مد نظر عامہ مسلمین کی خیر خواہی کا جذبہ تھا اور اس ذریعہ سے خراج جمع کر کے اسے مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی جو رائے ہوئی یہ عامہ خلائق مسلمین کی نفع رسانی کے لئے تھی؛ اس لیئے کہ لوگوں کو داد و دہش اور آذوقوں میں اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو سرحدوں پر فورس نہ ہوتی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے لشکر مسلح اور طاقت ور نہ ہوتے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک کثیر تعداد چھوڑی تھی، زمانہ اور وقت کے لحاظ سے جب نئے نئے مسائل پیش آئے تو لوگوں نے انہیں کی طرف رجوع کیا۔ مختلف دیار و امصار میں یہ پھیلے اور رفتہ رفتہ ان کے شاگردوں کی ایک تعداد وجود میں آئی، مدینہ میں عائشہ صدیقہ،

---

۶ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسفؒ۔

زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، وغیرہم کے شاگرد نافع، عروہ بن زبیر وغیرہ وغیرہ، مکہ میں عبداللہ بن عباس کے شاگردوں میں عکرمہ مجاہد جیسی شخصیتیں، مصر میں عبداللہ بن عمرو کے شاگردوں میں یزید بن حبیب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، ان شاگردوں کے استدلال کے طریقے وہی تھے جو ان کے اساتذہ کے، لیکن ان کے استدلال کے اصول وضوابط غیر منضبط اور غیر مرتب ہی رہے، دوسری صدی میں جاکے اجتہاد اور استخراج مسائل کے اصول فی الجملہ مرتب ہوئے، امام مالک مدینہ میں، امام ابوحنیفہ عراق میں، امام شافعی، امام اوزاعی، اور لیث بن سعد مصر اور شام میں مقتضائے زمانہ اور مکان کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے معاصر نہ تھے، لیکن تھے دوسری ہی صدی میں۔ ان مجتہدین نے اصول اور ضوابط کے تحت فتوے دیئے۔

تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے شروع میں فقہاء کے بادی النظر میں دو گروہ ہوگئے، ایک نے متقدمین کے اصول اپنائے اور دوسرے نے مجرد تقلید کی جگہ کچھ اپنے اصول بھی مرتب کئے۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں قاضی ابویوسف، امام محمد، زفر اور حسن بن زیاد۔ امام مالک کے شاگردوں میں ابن نافع، ابن الماجشون۔ امام شافعی کے تلامذہ میں بویطی، مزنی وغیرہما نے اپنے اپنے اساتذہ کے اصول اپنائے اور انہیں کے تحت مسائل حاضرہ کا استخراج کیا، جنہوں نے ان اصولوں کی تقلید نہیں کی ان میں امام احمد بن حنبل اور داؤد ظاہری کے نام عنوان میں لئے جا سکتے ہیں۔ ان کے بعد جو علماء پیدا ہوئے انہوں نے تیسری اور چوتھی صدی کے مجتہدین کے اصول کی روشنی میں فتاوے دیئے۔ اور اغلب یہ ہے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد حق کا باب بالکل مسدود ہوگیا تھا۔ بعد کو جب تقلید کا دور شروع ہوا اور کسی نے اصول میں اور کسی نے فروع میں تقلید شروع کی، اصول میں تقلید کرنے والے شاگردوں میں اپنے اساتذہ سے اختلاف آخر تک بھی رہا کیا۔ چوتھی صدی کے نصف آخر اور پانچویں کے اوائل میں جو ائمہ پیدا ہوئے انہوں نے عموماً اقوال جمع کئے اور اختلافات اور اتفاقات کی چھان بین کی، اس سلسلہ میں طحاوی اور کرخی احناف میں اور ابن ابی یزید مالکیہ میں مروزی ابن اسحاق شافعیہ میں حنابلہ میں الخرقی ہوئے ہیں۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں جو ائمہ ہوئے انہوں نے اپنے حلقہ کے مختلف مکاتب فکر سامنے رکھ کے رائیں قائم کیں اور اسلاف ائمہ کی رایوں میں جو رائے ان کو زیادہ مناسب معلوم ہوئی اس پر عمل درآمد کیا اور اسی کے موافق فتاوے دیئے، اس فہرست میں کاشانی قاضی خان اور مرغینانی وغیرہ وغیرہ کے نام آتے ہیں، ساتویں اور آٹھویں صدی میں مرتبین فتاوی کے مختلف انداز رہے کسی نے راجح اقوال جمع کئے، کسی نے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد

راجح قول کے دلائل نقل کر دیئے ۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پانچویں صدی میں ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی جس نے تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے قاضی ابو بکر اندلسی جو چھٹی صدی میں ہوئے، انہوں نے کتاب العواصم من القواصم اسی موضوع پر لکھی، چھٹی صدی ہی میں ابن رشد، ساتویں میں عزالدین ابن عبدالسلام، تقی الدین ابن دقیق العید، نے اگرچہ تقلید کی کھلے بندوں مخالفت تو نہیں کی تاہم اجتہاد کے میدان کو وسیع تر ضرور کر دیا۔ پھر علامہ ابنِ تیمیہ نے تقلید کو رانہ پر سخت سے سخت تنقید کی اور اس کے بعد ان کے شاگرد علامہ ابن قیم نے اس کی تائید اور ترویج و اشاعت میں زورِ قلم صرف کر دیا، مصر میں ابنِ حجر عسقلانی اور ان کے شاگردوں نے بھی کسی حد تک اپنے اجتہاد کے بل پر فتوے دیئے، یہاں تک کہ ان کے ایک شاگرد جلال الدین سیوطی نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

"اجتہاد ہر زمانہ میں فرض ہے"

دسویں اور گیارھویں صدی میں اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہاء نے بڑے بڑے کام کیئے اور خاص خاص نقاط نظر کو سامنے رکھ کے کتابیں اور فتاوے مرتب کیئے جن میں خصوصیت کے ساتھ خیرالدین رملی کے فتاویٰ اور سلطان عالمگیر اورنگ زیب کے جمع کرائے ہوئے مافی الموضوع فتاوی ہندیہ، بارھویں اور تیرھویں صدی میں بھی فقہِ اسلامی کے سلسلے سے بڑے بڑے کام ہوئے، اور ان میں دو ہستیاں شاہ ولی اللہ دہلوی اور محمد بن علی شوکانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔